ڈاکٹر حسن رضوی

# اشفاق حسین۔اجنبی مسافر

آج کی شام اور آج کی شام کا اہتمام جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اجنبی مسافر اشفاق حسین کے نام ہے۔ وہ اس سرزمین پر تشریف لائے ہیں جوان کی اپنی ہے۔آج بھی اور کل بھی اس جنت پر کسی شداد کا کوئی قبضہ نہیں۔کسی فرعون کا حصہ نہیں۔

اس دھرتی سے توڑ کے رشتہ واپس جانے والوں کو
اول اول خوش ہونا ہے۔ آخر آخر رونا ہے

اشفاق حسین آج اس تقریب میں سرزمینِ پاک کے اس خطہ میں تشریف لائے ہیں جو مردم خیز بھی ہے اور قدر شناس بھی ، ان لوگوں میں تشریف لائے ہیں جو پیان وفا کرتے ہیں اور نبھانے کی خُو سے آشنا بھی ہیں جو محبت کرتے ہیں تو اس طرح کہ اجنبیت کے دھنک رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔

سمندر چھوڑ آئے کوہ و دریا چھوڑ آئے ہیں
نئی دنیا کی خاطر ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
پہن کر ہم لباسِ اجنبیت کس طرح جائیں؟
کہ ہم اپنا بدن لائے ہیں چہرا چھوڑ آئے ہیں

اجنبیت کے اس سفر میں شاعر کا واحد ہتھیار صداقت ہے- اپنی مٹی سے محبت کرنا ہر تخلیق کار کا منشور ہے۔اسے اپنے دیس کی صبحیں اچھی لگتی ہیں۔ پرندوں کے نغمے روح میں اترتے ہیں اور سانولی شامیں خوشگوار محسوس ہوتی ہیں گو کہ اداسی ہی شاعر کا مقدر ہے۔ششش و پنج کی کیفیات انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ افکار کے دریاؤں میں اترنا تو آسان ہے مگر غوطہ زن ہو کر لعل و گوہر سے دامن کو بھرنا آسان

نہیں ہوتا۔ بہت سے موسموں سے الجھنا پڑتا ہے جس وحبر کا موسم، وحشت و کرب کا موسم، دشت و دمن کا موسم، ہجر و فراق کا موسم، آنسوؤں کی بارش کا موسم، ان تمام لعل و گوہر کی مالا سے پیکر سجائیں تو حسن آگہی کا ماہتاب روشن ہوتا ہے۔ اشفاق حسین کے ہاں بھی خود آگاہ اور خود نگر محبت کی نفسیاتی صداقتوں کا رچاؤ قابل دید ہے۔ کبھی کبھی جب چراغ شام کے دیئے جلنے کا انتظار کرتے کرتے وحشتِ عشق کا اسیر اجنبی سمندر کے اجنبی جزیروں کا نشان ڈھونڈتے ڈھونڈتے سبز پانیوں میں کشتیٔ رزق کھینے کی بے طلب مشقت میں مصروف ہو جاتا ہے تو تلاشِ ذات کے جنگل میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ شاید کہ یہ شرط وضع داری بھی ہے اور وصف پردہ داری بھی

کئی موسم گئے پر ہجرتوں کا دکھ ابھی تک ہے
یہ سناٹا مرے اندر کا میری زندگی تک ہے

اشفاق حسین کے ہاں رونما ہونے والی ہجرت کی دھند نے بے در و دیوار حصاروں میں بھی نیندوں اور رتجگوں کو راستوں اور مسافتوں کو دھندلا رکھا ہے جس میں ہاتھ کی ابھرتی لکیروں پر مقدر کی وحشتوں کا غلبہ ہے۔ نہ تو خوابوں میں تعبیروں کے واضح عکس نظر آتے ہیں اور نہ حقیقت کے ماہتاب ہی اندھیری شبوں کے گواہ بنتے ہیں۔ صبح بیدار سے شب بیتاب تک بس یہی کہتا سنائی دیتا ہے۔

عہد استوار سے عرصۂ انتشار تک جانے کتنے بے ساحلوں پر تجربوں اور مشاہدوں کی سیپیاں چننا پڑیں، نجانے کتنی بار نرم ہاتھوں کی پوریں چھلتی رہیں۔ ان گنت خواہشوں کی ریت سے آرزوؤں کے گھروندے بنائے گئے اور وقت کی لہروں سے شکست کھائی گئی۔ یہی وجہ ہے خوف کے خیمے اس کے پیکر سے یوں لپٹے ہیں کہ کوئی بازگشت کوئی ان سنی آوازوں کی زنجیریں اس کی سماعت تک نہ پہنچ سکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دیار غیر میں بھی اداسی کے چراغ جلتے ہیں تو عجب عالم خود فریبی اور خود فراموشی طاری

ہوتا ہے کہ اپنا آپ بھی اجنبی دکھائی دیتا ہے۔شعور رائیگانی اور جذبہ بے دلی روح کو ویران کر جاتا ہے تو پھر ایسے میں کارِ سُخن وحشتوں کی کلفتوں کو آسان کر دیتا ہے اور شاعر قرض کے گھر میں یوں اترتا ہے:

خوبصورت سہی نوچے ہوئے پَر کس کے ہیں
شاخ در شاخ یہ ہجرت کے ثمر کس کے ہیں
شہر کی ساری عمارات ہیں کن لوگوں کی
قرض پر سب نے جو لے رَکھے ہیں گھر کس کے ہیں

اس کشمکش ترک وطلب میں ہوا کے ہونٹوں پر آندھیوں کے وہ نوحے وقفِ سماعت ہوتے ہیں کہ آنکھوں کے سارے دیپ بجھ جاتے ہیں تو پھر اس سمے چہرۂ کمال کیا؟ تیشۂ سوال کیا؟ عہدِ بے مثال کیا؟ شہرِ خوش خیال کیا؟ سارے رنگ ایک ہی رنگ میں سما کر امر ہو جاتے ہیں۔

وہ رنگ ہے ''رنگِ ابنساطِ صبر''

پوچھ سکتا ہی نہ تھا کوئی وہاں پر یہ سوال
پیڑ کیوں کٹ گئے پھولوں کی حفاظت کے لیے
آنکھ کے ریشمی تاروں سے بُنا نہ کوئی خواب
ورنہ ترسو گے شب و روز بصیرت کے لیے

خیمۂ جاں میں جب شعورِ ذات کا لاوا پگھلتا ہے تو پھر جواب کیا ہے۔۔سوال کیا ہے۔۔رنجشِ سودوزیاں کیا ہے۔۔شوق لازوال کیا ہے۔۔رقصِ لازوال کیا ہے۔۔رقصِ جمال کیا ہے۔۔کشمکشِ ماہ وسال کیا ہے۔۔ نہ تو ہے نہ میں ہوں۔۔ نہ فنا ہے نہ بقا۔۔۔۔۔۔۔۔۔تسلیم ورضا۔۔عجز ووفا۔۔ حصولِ منزل کا شوق نہ زوالِ شام کا ڈر۔۔۔۔ شعورِ ذات سے مقامِ کبریا تک۔۔ جہاں جبریل کے

پَر چلتے ہیں۔۔اور وقت رُکتا نہیں۔۔سانسیں تھکتی نہیں۔۔دل بہلتا نہیں۔

سر پہ جو خود لے کر نکلا ہو چراغ
لوگ اس کو راستہ دکھلائیں کیا

اجنبی سمندر کے اجنبی جزیرے پر روکا ہوا شام کا پہلا جھونکا سفید مرغاب کی طرح اپنا رُخ بدلتا ہے تو خمار آلود آنکھیں نیند سے منحرف ہو جاتی ہیں۔فرطِ جنوں میں آنسو پلکوں کے آستاں پر سجدے کرنے لگتے ہیں۔گھر سے نکلا ہوا مسافر اپنی مسافتوں کی ساعتیں شمار کر کے پکار اٹھتا ہے۔

نکلے تھے جو گھر سے تو یہ معلوم تھا ہم کو
مٹی کے گھروندے ہیں تو سیلاب بھی ہونگے

امید واثق ہے کہ اشفاق صاحب کو آج کی شام زندگی کی آخری شام تک یاد رہے گی کیونکہ ہم نے اس شام میں اپنی مہکتی سانسوں کی خوشبوں،چاہتوں کی مالا ادھ کھلی کلیوں کی معصوم وفا کا رنگ بھرا ہے،اس دھرتی پر اترنے والے مسافر کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہزار جگنوؤں کو پلکوں پر سجا رکھا ہے۔